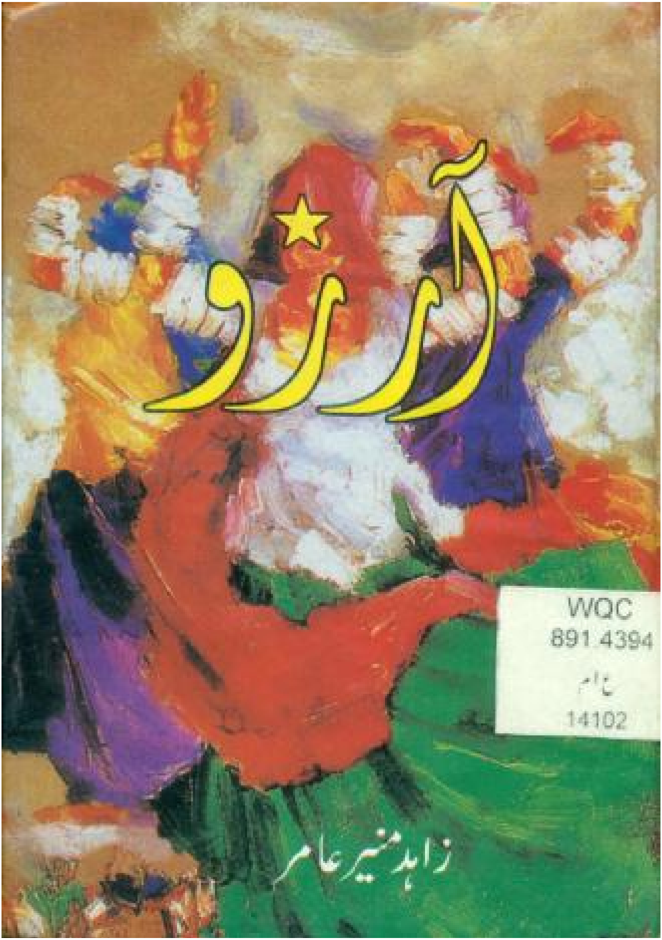

آرزو
زاہد منیر عامر
WQC
891.4394
14102

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آرزو

مخدوم گرامی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

کے لئے

اخلاص کے ساتھ

زاہد منیر عامر

٢٦
١٢
٢٠٠٢

آرزو

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

Trigon ٹرائیگان
Pharmaceutical International
راجہ سنٹر، پہلی منزل، F-22، مین بلیوارڈ، مین مارکیٹ، گلبرگ II، لاہور

"لمحوں کا قرض" سے انتخاب:
رشید فیصل ایم اے

اشاعت-------- بہار ۲۰۰۲ء
تعداد------------ پانچ سو
مطبع --------
قیمت -------- پچاس روپے

Aarzo
(The Wish)

Written by: ***Dr. Zahid Munir Amir***
Assistant Professor, Department of Urdu,
University of the Punjab, Lahore
PAKISTAN 092-042-9210832

Published in Spring 2002

ترتیب

ندیا

کے نام

زندگی جوی روان است و روان خواہد بود

آخر کیوں؟ ....

آرزو کیا ہے...... آرزوئیں بے نتیجہ کیوں رہ جاتی ہیں...... کیا زندگی میں آرزو ضروری ہے ...... بلند آرزو کیا ہوتی ہے...... ہم اپنے ارادے کی طرح اپنی آرزوؤں کی دنیا میں آزاد ہیں یا مجبور ...... کسی شخص کے تعارف میں اس کی آرزوئیں ہماری کیا مدد کرتی ہیں......

ہم معاشرے میں زندگی کیوں گزارتے ہیں ......
معاشرتی ضروریات اور فکرِ معاش میں کیا رشتہ ہے
......عصرِ حاضر میں ہم پر مسلط ہو جانے والی فکرِ معاش
نے ہمیں کن الجھنوں میں ڈال دیا ہے ...... کیا ہمارے
عہد میں کوئی ذہنی انقلاب آ رہا ہے ...... اگر ہاں تو پھر
اس کی سمت کیا ہے ...... ہمارے ہاں ظاہر پرستی کی
روش نے ہم سے کیا کچھ چھین لیا ہے...... ہمارے ہاں
مقاصد کے لیے بننے والی جماعتیں خود مقصد کیوں بن
جاتی ہیں......

فرد کے امکانات کیا ہیں ...... انھیں کیسے بروئے
کار لایا جا سکتا ہے...... فرد اپنے امکانات اور صلاحیتوں

کی بہتر تنظیم کیسے کر سکتا ہے...... ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیاں ٹھوس عناصر سے خالی کیوں ہوتی جا رہی ہیں اور جب قومی زندگی ٹھوس عناصر سے خالی ہو جائے تو کیا نتائج نکلا کرتے ہیں......

اگر آپ کو ان سوالات یا ان کے جوابات سے کچھ بھی دلچسپی ہے تو پھر یہ ''آرزو'' آپ ہی کے لیے ہے......

زاہد منیر عامر
استاد شعبہ اردو
و
سپرنٹنڈنٹ ہاسٹل نمبر ۷
پنجاب یونیورسٹی

لاہور:
آغاز بہار ۲۰۰۲ء

اگر زرمزِ حیات آگہی مجوی و مگیر
دلی کہ از خلشِ خارِ آرزو پاک است

دوا

دردکی

کی ہے

مجروح

تیغِ آرزو

رہنا

برادر عزیز! جب میں نے تمھیں اپنی آرزوؤں کی فہرست پر نگاہ ڈالنے کو کہا تو تم نے بڑے صوفیانہ انداز سے زندگی میں آرزوؤں کی پیدا کردہ تکالیف کا تذکرہ کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے تم اپنے مسائل کا سبب اپنی آرزوؤں کو سمجھ رہے ہو، ان کی بے سمتی یا بے نیشی کو نہیں۔

تم آرزو سے بغاوت کے جس مرحلے میں داخل ہو رہے ہو وہاں یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ زندگی سے آرزوؤں کو خارج نہیں کیا جاسکتا اگر کوئی یہ چاہے کہ اس کی زندگی میں کوئی خواہش نہ ہو تو بجائے خود یہ چاہنا بھی تو ایک خواہش ہے[1] جہاں تک اس مخصوص نقطہ نظر کا تعلق ہے جس میں دل کو آرزوؤں سے پاک کرنے کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے، اس میں بھی مجرد آرزو کا انخلا مطلوب نہیں ہوتا بلکہ آرزوؤں کی تطہیر مطلوب ہوتی ہے ان کی شدت اور سمت کو بدلنے کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے...... مذہب نے بھی آرزو

---

1. ہے طلب بے مدعا ہونے کی بھی اک مدعا
مرغ دل دام تمنا سے رہا کیونکر ہوا

کی مخالفت نہیں کی بلکہ آرزو کے اعتبار سے انسانوں کو
دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ان الگ الگ حصوں کے
انسانوں کو ان کے انجام سے باخبر کرنا چاہا ہے۔

آرزو کی مخالفت کیسے کی جاسکتی ہے کہ آرزو تو
زندگی کا دوسرا نام ہے، زندگی آرزو سے نشوونما پاتی ہے
اور آرزو زندگی ہے۔

؎ باد صبا کی موج سے نشوونمائے خاروخس
میرے نفس کی موج سے نشوونمائے آرزو

زندگی کو خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی ہے۔ یہ
خوب سے خوب تر کی تلاش کیا ہے؟ آرزو ہی تو ہے
......خوب کی آرزو! خوب تر کی آرزو......! یہ سارا نگار

خانہ آرزو ہی کا کرشمہ تو ہے انسان، زندگی، کائنات......
چہل پہل، رونق، ہنگامے، کامیابیاں، ناکامیاں، عروج
زوال، موت، سب آرزو ہی کے کرشمے ہیں کہیں
ہماری آرزو کے اور کہیں دوسروں کے آرزوؤں کے۔

آرزو صرف زندگی کی تزئین ہی نہیں کرتی بلکہ اس
کے حقائق کا عرفان بھی عطا کرتی ہے آپ آرزو کی
تکمیل کی خواہش لے کر ایک سفر پر نکلتے ہیں۔ اس سفر
کی اونچ نیچ، نشیب و فراز آپ کے لیے زندگی کی اونچ
نیچ اور نشیب و فراز سے آگہی کا باعث بنتے ہیں......
آرزو کی تکمیل زندگی کی کامیابی بن جاتی ہے...... عدم
تکمیل بھی خالی ہاتھ نہیں جانے دیتی۔ بہت کچھ سکھاتی

ہے ...... یہ سیکھا ہوا علم، تجربہ، آموزش ...... دوسری مہم سر کرنے کے کام آتا ہے۔ ایک نئی منزل کی طرف پیش قدمی کے لیے زادِ سفر فراہم کرتا ہے۔ اور نئی منزلوں کی طرف سفر جاری رہنا ہی تو زندگی ہے۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

آرزوؤں کے چراغ راستوں کو روشن کرتے ہیں زندگی کی تاریکیوں میں راہیں روشن کرنے والے یہ چراغ انسان کے بہترین دوست بھی ثابت ہوتے ہیں ...... تم کہو گے وہ کیسے؟ ...... ہاں آرزوئیں ہماری بہترین دوست ہیں اس لیے کہ جب ارد گرد کی

دوستیاں چھن جاتی ہیں تو ہم اپنی تمناؤں کی روشنی کے جلو میں ایک نئی دنیا کے تسخیر کے سفر پر روانہ ہو سکتے ہیں جب ایک منزل مل جاتی ہے تو باطن کی آگ میں شدت باقی نہیں رہتی، نئی آرزو میں اس آگ کی تمازت کو قائم رکھتی ہیں آرزو کی آگ کے روشن رہنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ان مقامات کے منفی پہلوؤں سے بچا جا سکتا ہے۔ جہاں ہم پہنچ چکے ہوں...... اس لیے کہ یہ مقام ہماری منزل ہی نہیں، ہماری منزل تو اس سے آگے اور آگے بہت آگے ہے۔ ہماری توجہ اپنی منزل پر ہونی چاہیے نہ کہ راستے کے پیچ و خم پر......

حاصل ہو جانے والی منزلیں راستے کے پڑاؤ ہی تو

ہوتے ہیں۔ یوں بھی آرزو کی رفعت اور شدت انسان کو چھوٹے چھوٹے مسائل و معاملات سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ خاروخسِ چمن اس کی نگاہوں میں بار ہی نہیں پاتے اس کے لیے تیغِ آرزو کے مجروح رہنے ہی میں ہر دکھ کی دوا پوشیدہ ہوتی ہے۔

آرزو کا پورے نہ ہونا کچھ عیب کی بات نہیں...... کہ یہی تو زندگی ہے، البتہ آرزو کا نہ ہونا موت ہے۔ آرزو زندگی ہے اور زندگی کا حسن ہے، صرف یہی نہیں کہ زندگی میں یہ حسن ہونا چاہیے بلکہ اس غازے سے زندگی کے چہرے کو حسین تر بنانے کی کوشش جاری رہنی چاہیے...... یعنی آرزو بلند ہونی چاہیے...... آرزو کی

بلندی کا کم سے کم معیار یہ ہے کہ اگر اوائل عمر کی آرزو ادھیڑ عمر میں پوری ہو جائے تو اس پر شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

مجھے تمھارے فلفسیانہ ذہن سے امید ہے کہ تم آرزو کی بلندی کے مبحث کو چھوڑ کر آرزو کے ارادے اور اس کے امکان کا سوال اٹھاؤ گے...... کہ آیا انسان آرزوؤں کے باب میں آزاد و خود مختار بھی ہے......؟ وہ اپنے حالات، مسائل اور تمدن کا پابند نہیں ہے......؟ کیا وہ ان سے بلند ہو کر بھی آرزو کر سکتا ہے؟

آرزو پر یہ وہی اعتراض ہے جو جبریت پسند (Determinists) اور لزومیتی فلاسفہ (Necessarians)

نے بھی کیا ہے صرف یہی نہیں انھوں نے تو انسان کے
اپنے ارادوں میں آزاد ہونے کے تصور پر اور بھی
اعتراضات کیے ہیں لیکن ارادے کی آزادی پر ان
فلسفیوں کے اعتراضات جاننے سے پہلے یہ جان لینا
چاہیے کہ ارادہ، آرزو ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔
جبریت پسند فلاسفہ کہتے ہیں، انسان کے ارادے کا تعین
اس کے حالات میں موجود قوی ترین محرک سے ہوتا
ہے بالفاظ دیگر ہمارے حالات و ماحول میں جو چیز سب
سے زیادہ مضبوط ہو ہمارے ارادے اس کے پابند
ہوتے ہیں...... تسلیم کہ ارادے کا انحصار ہماری مخصوص
صورت حال کے قوی تر محرک پر ہوتا ہے...... سوال یہ

ہے کہ یہ قوی محرک، قوی محرک کیوں ہے؟ اور یہ صورت حال ہماری صورت حال کیوں ہے؟ کسی اور کی کیوں نہیں؟......

یہ صورت حال ہماری صورت حال اس لیے ہے کہ یہ ہماری پسند ناپسند کی بنیاد پر پیدا ہوئی ہے۔ یا اسے ہم نے قبول کیا ہے۔ اور یہ قوی محرک ہمارے لیے قوی محرک اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اسے اپنی ترجیحات کے باعث قوت مہیا کی ہے یا اسے قوت مہیا کرنے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ اس لئے ارادہ بالآخر ہماری ترجیحات پر منحصر قرار پاتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ انسان کے کاموں کی پیش

گوئی کی جاسکتی ہے یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ بہت سے انسانی کاموں کے بارے میں قبل از وقت اندازہ لگا لیا جاتا ہے کہ وہ کیسے ہوں گے...... اس سے نتیجہ نکالا گیا کہ انسان کے ارادے کا تعین پہلے کی حالت سے ہوتا ہے، اس کے عزم یا خواہش سے نہیں۔

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ کسی انسان کے کام کی پیش گوئی کس بنیاد پر کی جاتی ہے؟...... یہ تو تم جانتے ہی ہو گے کہ پیش گوئی کی بنیاد معمول اور عادت ہوتی ہے۔ یہ معمول اور عادت (فرد کے باب میں) کیا ہے؟...... اگر ہمارے معمولات اور عادات میں ہماری شخصیت اور ہماری پسند ناپسند جھلکتی ہے اور یقیناً جھلکتی

بلکہ چھلکتی ہے تو پھر ہم اپنے ارادوں اور تمناؤں میں مجبور کیسے ہوئے؟

ایک اعتراض علت و معلول کے نظریے کے حوالے سے بھی کیا جاسکتا ہے، علت و معلول کا نظریہ یعنی کائنات میں کوئی شے بھی کسی وجہ کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہوتی۔ اس کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے ذہنی اعمال بھی علتوں سے آزاد نہیں ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ارادہ، جسے ہم خواہش کی ایک ترقی یافتہ شکل قرار دے چکے ہیں خود ایک معلول (Effect) یا نتیجہ ہے اور اس کی علت (Cause) یعنی وجہ انسان کی ذات ہے، اس کی دل چسپیاں ہیں، جیسی دل چسپیاں

ہوں گی' جیسی ذات ہوگی' جیسی علت ہوگی' ویسا ہی معلول ہوگا' نتیجہ ہوگا۔ ذات اور دل چسپیاں تو ہماری اپنی ہیں' جب ذات اور دل چسپیاں ہماری اپنی ہیں تو پھر ارادہ اور آرزو پابند ہوئے یا آزاد؟

انسان کے اپنی امنگوں' آرزوؤں اور ارادوں میں مجبور ہونے کی ایک اور دلیل جو دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ خدا پہلے سے تمام انسانی افعال سے آگاہ ہے اور اس کا مطلب ہے کہ انسان ایسا کرنے پر مجبور ہے اور جب مجبور ہے تو اس کے ارادے اور آرزو کا اس کے اعمال میں کیا دخل؟

یہ بھی ایک بڑا مغالطہ ہے۔ خدا کے ہمارے

کاموں سے آگاہ ہونے کا مطلب' جبر نہیں ہے بلکہ اس کی یہ پیش آگہی اس کے وقت پر حاوی ہونے کی وجہ سے ہے۔ ہم اپنے محدود تصورِ وقت کی بنا پر اس حقیقت کو سمجھنے میں ٹھوکر کھاتے ہیں۔ ہمارا تصورِ وقت ماضی' حال اور مستقبل کے چند خانوں تک محدود ہے۔ ہم ان سانچوں سے آگے دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوتے جبکہ خدا کے نظام میں وقت' ایک مسلسل اور مستقل حال ہے۔ اس کی نگاہوں پر ماضی اور مستقبل بھی حال کی طرح روشن ہیں۔ اس لئے وہ گزشتہ اور آئندہ کی خبر رکھتا ہے۔ خبر کیا معنی' یہ سب کچھ اس کے سامنے ہے اور ہر وقت ہے۔ ہم اس کے نظامِ وقت کی وسعت اور

عظمت کو نہ سمجھنے کے باعث اس کی پیش آگہی کو جبر پر محمول کرتے ہیں' جو درست تصور نہیں ہے۔

ہم اپنی آرزوؤں' امنگوں اور ارادوں میں آزاد ہیں۔ فعال ہیں۔ خود مختار ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر تمام اخلاق اور مذہبی نظام بے معنی ہوتے اور اعلیٰ انسانی اذہان انھیں قبول نہ کر سکتے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ دنیا نے ہمیشہ اعلیٰ اخلاق و مذہبی قدروں اور نظاموں کو پسند کیا ہے اور تاریخ انسانی انھی اعلیٰ قدروں کی بقا اور تسلسل کی تاریخ ہے۔ ان اعلیٰ اخلاق، مذہبی اور روحانی نظاموں کی تعلیم کا اسلوب کیا ہے؟...... کچھ کاموں کے کرنے کی ہدایت اور کچھ سے اجتناب کی نصیحت

کانٹ (شخصیت ۷) نے درست کہا تھا کہ "اگر ارادہ آزاد نہ ہوتا تو فرض، ذمہ داری، خیر و شر حسن و قبح وغیرہ ایسی تمام اصطلاحات اور تصورات بے معنی ہوتے۔"

البتہ یہ ضرور ہے کہ ارادے کا تعین ہماری تعلیم، تربیت، محسوسات اور سماج کے دائروں میں رہ کر ہوتا ہے...... یہ حد بندی بھی کوئی غلامی نہیں ہے بلکہ یہ انسان کے ایک تمدنی نظام میں شامل ہونے کی قیمت ہے، یہی تو معاہدہ عمرانی (سوشل کنٹریکٹ) ہے جس میں انسان کچھ انفرادی حقوق سے دستبردار ہو کر کچھ اجتماعی حقوق حاصل کرتا ہے...... اس لیے سماج، معاشرت، تعلیم، ریاست و سیاست کی اثر اندازی،

غلامی یا جبریت کا مظہر نہیں بلکہ خالص اختیاری اور انسان کی اپنی پسندیدہ ہے۔

انسان معاشرتی نظام میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے حقوق سے مستفید ہونا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ معاشرے کے دائرے میں محدود ہو کر رہتا ہے..... لیکن اس پر یہ لازم نہیں، یہ بہتر ہو کہ وہ اس سے بھی اوپر اٹھنے کی کوشش کرے...... بلندی کے لیے کوشاں ہو، معاشرتی رسوم و رواج کی اہمیت کو سمجھے لیکن اپنا جہان ستاروں سے آگے تلاش کرے۔ ہائیڈگر (شخصیت ۱۱) نے تو کہا تھا، کسی معاشرے کی روایتی قیود کا پابند ہو کر رہنا فرد کی حقیقی زندگی نہیں

بلکہ اس عام روش کے برعکس اپنے امکانات کا تحقق اور تسلسل جاری رکھنا ہی دراصل کسی فرد کا حقیقی وجود ہے......

کسی معاشرے کی قیود کو حقیقی زندگی قرار نہ دینے سے عام معنوں میں تعلیمِ بغاوت مراد نہیں لینی چاہیے بلکہ اس سے مراد اپنی ہستی کے وسیع تر امکانات کا سراغ پانا ہے۔ اقبال (شخصیت ۱) نے عصرِ حاضر سے شکوہ کیا تھا کہ اس نے ہمیں ہماری ہستی کے امکانات سے بیگانہ کر دیا اور ہم ایک جوئے کم آب میں گھٹ کر رہ گئے ہیں...... اس عہد نے دماغوں کو مخصوص الجھنوں میں ڈال کر دل کو زندہ تمناؤں سے محروم کر دیا ہے اسی

لیے اقبال (شخصیت ۱) کا کہنا ہے:

خویشتن را تیزی شمشیر دہ   باز خود را در کفِ تقدیر دہ

اندرونِ تست سیلِ بے پناہ   پیشِ او کوہِ گران مانند کاہ ۱

تمناؤں اور زندہ آرزوؤں سے محرومی کے عالم میں جو ماحول پروان چڑھتا ہے اس کا نقشہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو...... انسانی آرزوؤں کا دم گھٹتا ہے تو ارادے دم توڑتے ہیں...... پرانے ارادے دم توڑتے ہیں تو نئے ارادے جنم نہیں لیتے...... نتیجہ معلوم، زندگی گھٹن، فرسودگی اور بے چارگی کا شکار ہو جاتی ہے۔

---

۱ پہلے خود کو تلوار کی سی تیزی عطا کرو پھر اپنے آپ کو تقدیر کے ہاتھوں میں جانے دو تمہارے اندر (توانائیوں کا) ایک بے پناہ سمندر پوشیدہ ہے جس کے سامنے بڑے بڑے پہاڑ بھی پر کاہ کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔

زندگی کی یہ تصویر دیکھنے کے لیے ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔

عصرِ حاضر کے ملک الموت نے ہمیں فکر معاش دے کر روح اور بلندی نگاہ چھین لی ہیں...... بلندی نگاہ بلند آرزوؤں کا سبب ہوتی ہے، بلند آرزوئیں بلند ارادوں کا ...... بلند ارادے زندگی کی شکل تبدیل کر دیتے ہیں۔ اسے رفعت عطا کرتے ہیں......ہم مظاہر کے حکمران ہونے کی بجائے ان کے محکوم ہوتے جارہے ہیں ہماری امنگیں محدود، آرزوئیں محدود تر، ارادے ضعیف اور نتائج افسوس ناک نکل رہے ہیں۔ بحث کو بڑے تناظر سے چھوٹے تناظر کی طرف

لائیں اور دیکھیں کہ آج ہمارے نوجوان کی بڑی بڑی خواہشیں کیا ہیں؟

ایک خوش حال زندگی، کوٹھی ، کار ، بینک بیلنس......

اور بس؟ اس کے لیے آرزوئیں کیا ہیں؟ تجارت، کاروبار، بیرون ملک ملازمت، مقابلے کے امتحان یا زیادہ زر افزائی کرنے والے اداروں میں شمولیت

......اور بس

یہ درست ہے کہ اجتماعی خوش حالی کے لیے فرد کی خوش حالی لازمی ہے اور اسے اپنی ذات کے لیے ایسے مقاصد متعین کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اگر افراد اجتماعی ترقی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے انفرادی خوش

حالی کو ہی منزل بنالیں تو ایسا کرنے سے وہ توانائیاں جن سے کام لے کر فرد دنیا کی تقدیر بدل سکتا تھا صرف اپنی ذات کی تقدیر بدلنے پر صرف ہونے لگتی ہیں۔

فرد بھی سوچتا ہے کہ اس کی ذات کی فلاح یا اس کے خاندان کی بقا زیادہ اہم ہے...... جب کہ "بنی آدم اعضائے یک دیگراند" ...... کیا فرد، اس کا خاندان اس کی نسلیں دنیا سے باہر کی مخلوق ہیں؟ دنیا یا کم از کم اس کے ملک کی تقدیر بدلے گی تو ان کی تقدیر بھی تو بدلے گی، یوں بھی تو ایک خاندان میں ایک فرد کی کاوشوں کے سارے برگ و بار اس کی زندگی میں ظاہر نہیں ہوتے وہ چلا جاتا ہے، اس کے لگائے ہوئے پودے

پھل لاتے رہتے ہیں۔ آنے والی نسلیں ان کے پھل کھاتی ہیں بالکل ایسے ہی جیسے اکثر درخت کا بیج کوئی ڈالتا ہے، نگہداشت کوئی کرتا ہے اور اس کے سائے میں کوئی اور بیٹھتا ہے...... یہی تو زندگی کا عمل ہے...... اگر یہ نہ ہو تو زندگی کا کارواں آگے کیسے بڑھے؟

بات آرزو سے چلی تھی ...... سب کچھ کی اساس آرزو ہے۔ سب پھل پھول آرزو ہی کے بیج سے جنم لیتے ہیں...... آرزو جتنی بلند ہوگی اس کے نتائج بھی اتنے ہی بلند پایہ ہوں گے چھوٹی آرزوئیں بھی پوری تو ہو جاتی ہیں مگر ان سے بڑے نتائج نہیں نکلتے۔

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا

مرکز

کرليجئ

اپنے

خيالون

کو کهيں

برادر عزیز! اپنی صلاحیتوں کی جانب تمہارا بے
نیازانہ رویہ ہمیشہ میری توجہ اس دور کی ساری نوجوان
نسل کی طرف منعطف کرا دیتا ہے کہ جس طرح تمہیں
قدرت نے ایک زرخیز ذہن دے کر پیدا کیا ہے لیکن
تمہارے خاکۂ زندگی میں اس زرخیزی سے کسی فصل
کے سرسبز کرنے کا پروگرام شامل نہیں ہے اسی طرح

ہمارے اسّی فیصد بلکہ اس سے بھی زائد باصلاحیت
نوجوان بے جہت اور بے سمت زندگی گزار رہے ہیں
اور زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ وہ اس بے جہتی کا
کوئی ٹھوس ادراک بھی نہیں رکھتے اور جب کسی شے کا
ادراک ہی نہ کیا جائے تو اس کے نتائج سے آگاہی تو
ظاہر ہے بہت دور کی بات ہوتی ہے۔ میں جب کبھی
اس صورت حال پر غور کرتا ہوں تو اس کے اسباب میں
فکری انتشار مجھے سب سے زیادہ اہم سبب نظر آتا ہے
کہ افکار و نظریات کا جو سیلاب دور جدید میں ہمارے
سامنے آیا ہم اس سے مستفید ہونے یا اس سے نبرد
آزما ہونے کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار نہ کر سکے اور

چونکہ خود اپنے افکار و خیالات پر بھی عام طور پر کوئی
زیادہ گرفت یا ان کی روح تک رسائی موجود نہ تھی اس
لیے آنے والے دور کی تبدیلیوں نے ان سلسلوں کو
بالکل ہی خلط ملط کر کے رکھ دیا۔ کالج کی طالب علمی
کے زمانے میں یہ سوال کہ نوجوان نسل کے فکری انتشار
کا سبب کیا ہے؟ میرے ذہن میں ایک کانٹے کی طرح
چبھنے لگا تھا میں نے اپنے داخل کی دنیا پر نظر ڈالنے کے
بعد خارج کا ایک لمبا سفر کیا اور مختلف اصحاب نظر سے
اس کے اسباب دریافت کیے لیکن جو جوابات مجھے
حاصل ہوئے انھیں پا کر مجھے یہ خیال ہوا کہ میں تو
نوجوانوں کے انفرادی فکری انتشار پر غور کر رہا تھا اب

معلوم ہوتا ہے کہ یہ انتشار تو ہمارے ہاں بہت بڑے
پیمانوں پر بھی موجود ہے اور ہر آنکھ اسے ایک نئے
زاویے سے پرکھتی ہے بہت سے اصحاب نے سرے
سے فکری انتشار کی موجودگی سے ہی انکار کیا اور بعض
نے اسباب کی ایک طویل فہرست فراہم فرمائی مثلاً آواز
دوست کے مصنف مختار مسعود (شخصیت ۸) نے ملی نصب
العین کے آنکھوں سے اوجھل ہو جانے کو اس کا باعث
قرار دیا اور ملی نصب العین کا رشتہ جدوجہد آزادی سے
جوڑتے ہوئے قوم کے فکری و عملی مستقبل کو مشکوک قرار
دیا مرحوم مولانا محمد حنیف ندوی (شخصیت ۴) نے فکر کو
آگے بڑھنے اور ڈویلپ ہونے کے مواقع کی کمی یا عدم

فراہمی کو اس کا سبب قرار دیا انھوں نے زندگی کے گمبھیر
مسائل سے متعلق ہمارے علم کی کمی کو بنیادی خامی قرار
دیتے ہوئے مستقبل کے بارے میں کہا کہ جس
معاشرے کے پیش نظر کوئی ایسا ٹھوس نصب العین نہ ہو
جس کے حصول کی خاطر اس کی توانائیاں صرف ہوں تو
اس کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔
ڈاکٹر خورشید رضوی (شخصیت ۵) نے فکری انتشار کی
موجودگی کے سوال سے ہی اختلاف کیا اور موجودہ
صورتِ حال کو ذہنی انتشار سے تعبیر کرتے ہوئے فکری
تربیت کے فقدان کو اس کا سبب قرار دیا ان کے
نزدیک جذبہ، تربیت اور وسائل کی کمی ایسے محرکات نے

مل کر اس فضا کو تشکیل دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہماری قومی زندگی کی تمام سرگرمیاں ٹھوس عناصر سے خالی ہو چکی ہیں اور اس صورت حال میں ہمارا مستقبل ایک ''اگر'' سے مشروط ہو کر رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب (شخصیت ۱۰) اور احمد ندیم قاسمی صاحب (شخصیت ۹) کے جوابات سے ایک انتہائی رجائی (Optimistic) طرز فکر سامنے آیا ڈاکٹر وزیر آغا (شخصیت ۱۰) نے اس صورت حال کو جذبات کا تلاطم قرار دیا، ان کے خیال کے مطابق جب نوجوانوں پر ذمہ داریوں کا بار گراں آن پڑے گا تو جذبات کا یہ تلاطم خود بخود درست ہو جائے گا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب

نے اس سوال پر تفصیل سے گفتگو کی انھوں نے نوجوان
نسل میں کسی فکری انتشار کے عنصر کی موجودگی کو تسلیم
کرنے سے انکار کرتے ہوئے دور جدید میں ترقی کی
رفتار کو پرانے لوگوں کی سوچوں کی رفتار سے تیز تر قرار
دیا انھوں نے نام لیے بغیر جنریشن گیپ کی وجہ پرانے
لوگوں کا اپنے معیاروں کو نوجوان نسل کے فکر و عمل کی
کسوٹی کے طور پر استعمال کرنے کو قرار دیا قاسمی
صاحب کا کہنا ہے کہ پرانے احساسات اور جذبات
کے مقابلہ میں آج کے انسان کی نفسیات تک بدل گئی
ہے اس کے ساتھ ہی اس کے جذبات و احساسات کے
اظہار کی صورتیں بھی بدل گئی ہیں اس وجہ سے ہماری نئی

نسل فکری تغیر و تبدل سے دو چار ہے جسے غلطی یا غصے سے فکری انتشار سمجھ لیا جاتا ہے۔

یہ ساری رجائیت اپنی جگہ درست سہی لیکن میں ان مشاہدات کا کیا کروں جو ایک نوجوان ہونے کے ناتے مجھے ہر روز اپنے ہم عمروں کی زندگیوں سے حاصل ہوتے ہیں اول تو باصلاحیت نوجوان اپنی صلاحیت کا ادراک نہیں کرپاتے ، ان میں پوشیدہ فن کا اظہار لاشعور کی سطح پر ہوتا ہے دوسرے جب وہ عملی زندگی کے وسیع و عریض صحرا میں داخل ہوتے ہیں تو یہاں مشاغل و دلچسپیوں کی بوقلمونی اور رنگا رنگی دیکھ کر ان کی دل چسپیاں اور مصروفیات کثیرالجہات

(Multidimensioal) ہو جاتی ہیں جس کے نتیجے میں وہ ہرفن مولا بننے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں جب

Jack of all Trades Master of None کی حقیقت

ان پر عیاں ہوتی ہے تو وقت کے پلوں سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے نتیجہ معلوم ان کی توانائیوں کا ایک بہت بڑا حصہ فن کی شناخت اور پھر اس کے تحفظ کی مساعی ہی میں صرف ہو جاتا ہے، یوں فن کے ابلاغ اور ترسیل کا مرحلہ بہت دور ہو جانے کے ساتھ ساتھ اس کا (Time Period) بھی کم ہو جاتا ہے بلکہ اکثر اوقات تو لوگوں کو اپنی اصل صلاحیت اور دلچسپی کا علم ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ عملاً Exhaust ہو چکے

ہوتے ہیں۔

اگر یہ بات دائرہ خیال میں رکھ کر خود کو مطمئن کیا جائے کہ ہمارے زمانے میں ترقی کی رفتار کے تیز ہونے کے باعث ذہنی انقلاب آ رہا ہے تو پھر بھی یہ سوال تو بہ ہر حال باقی رہتا ہے کہ آخر اس انقلاب کی جہت کیا ہے۔؟ یہ درست ہے کہ ہر موقع پر اور ہر مسئلہ کے سلسلہ میں جہت کے تعین کا دو ٹوک فیصلہ نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے منفی او رمثبت پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر ایک رائے تو قائم کی جاسکتی ہے۔ اور یہ رائے قائم کرنے کے لیے ظاہر ہے کہ ہم اپنے اردگرد سے بے نیاز نہیں ہوسکتے۔

میں جب اپنے مشاہدے کی حد تک غور کرتا ہوں
تو طبیعت میں سخت بے چینی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ
آج نوجوان ''عرفان ذات'' کے مراحل سے روز بروز
دور سے دور تر ہوتا چلا جارہا ہے ''ادراک نفس'' یا سقراط
(شخصیت ۲) کے الفاظ میں Chose the self and
know the self کا عنصر اس کی زندگی سے خارج ہوتا
محسوس ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہی بنیادی عنصر ہے جو آگے
کو زندگی کی تمام سرگرمیوں کی عمارت کو تعمیر کرتا ہے۔
جس طرح ہمارے ماحول میں دین کی اصل روح سے
دوری اور ظاہر پرستی کا ظہور ہوا ہے اسی طرح نوجوانوں
میں بھی زندگی کے اصل مقاصد اور اپنے دائرہ عمل سے

ناواقفیت اور چند غیر ٹھوس اور غیر اہم اشیا کی طرف دل چسپی اور توجہ کا عنصر بڑھنے لگا ہے۔ مثلاً اگر کوئی نوجوان شعر کہنے لگتا ہے تو چند نظمیں، غزلیں کہہ لینے کے بعد وہ اپنے فن میں مزید نکھار پیدا کرنے اپنے مطالعہ کو وسیع کرنے یا شعر کی قدیم وجدید روایت سے اپنا رشتہ مضبوط کرنے کی بجائے جلدی جلدی اپنا کلام شائع کروانے کی فکر میں غرق ہونے لگتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک تخلیقی ذہن کے لیے محض خارجی سرگرمیوں انہماک، نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اور اس طرح بہت سے ایسے نوجوان جو شعر، ادب، فلسفہ یا زندگی کے دوسرے اہم شعبوں میں نمایاں کارکردگی کا

مظاہرہ کر سکتے ہیں ظاہر پرستی اور نمود و نمائش کی الجھنوں میں گرفتار ہو کر اپنے اصل جوہر کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

یہ محض ایک مثال ہے ورنہ ہر شعبہ زندگی میں ظاہر پرستی کا یہ المیہ شدومد کے ساتھ ظاہر ہو رہا ہے اور ہر آنے والا دن اس تدارک کی بجائے اس میں اضافہ کرتا چلا جا رہا ہے اس لیے اگر آغاز شباب ہی میں اپنی افتادِ طبع اور میلانات کو دیکھتے ہوئے اپنے لیے کسی شعبے کو منتخب کر لیا جائے اور پھر اپنی تمام تر توجہات اور سرگرمیاں اسی پر صرف کی جائیں تو نہ صرف یہ کہ زندگی کے با مقصد ہو جانے بلکہ جدوجہد حیات کے بار آور

ہونے کی بھی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے موجودہ معاشرتی نظام میں ایسا کوئی پروگرام موجود نہیں ہے جو زندگی کے نئے مسافروں کے لیے کسی لائحۂ عمل کا تعین کرے لیکن زندگی میں بڑے کام کسی کی طرف سے **Appointment** کے دیے جانے پر انجام نہیں پاتے بلکہ یہ ہمیشہ اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز پر عمل کرنے سے ظہور پذیر ہوتے ہیں جب تک ذوق خود راہنمائی نہ کرے کتنی بھی صلاحیت موجود ہو کوئی کام کماحقہ انجام نہیں دیا جاسکتا معاملہ صرف اور صرف اپنے اندر سے اٹھنے والی آوازوں کو سننے، پرکھنے، سمجھنے اور انتخاب کرنے کا ہے اگر یہ مرحلہ کامیابی

سے گزر گیا تو زندگی کے سفر کے اگلے مراحل بھی آسان ہوں گے اگر یہاں پر کسی الجھاؤ (Confusion) یا انتشار کا شکار رہے تو پھر تمام عمر اسی بے سمتی اور بے جہتی کا شکار رہنا پڑے گا جس میں توانائیاں تو صرف ہو جاتی ہیں لیکن حال یا مستقبل میں کارآمد نتائج کے برآمد ہونے کی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔

مرتکز کر لیجئے اپنے خیالوں کو کہیں
کیا ملے گا زندگی میں نت نئی ترمیم سے

مری

دعا

ہے تری

آرزو

بدل جائے

برادرِ عزیز! مجھ سے جب بھی کوئی دوست یہ سوال
کرتا ہے کہ تم کسی اجتماعیت میں شامل کیوں نہیں ہوتے
تو میں عام طور پر مولانا امین احسن اصلاحی (شخصیت ۲) کی
وہ بات دہرا دیتا ہوں جس میں مولانا اصلاحی نے کہا تھا
کہ "ہمارے ہاں جماعتیں مقاصد کے لیے بنتی ہیں مگر
بعد میں جماعتیں خود مقصد بن جاتی ہیں" حقیقت یہ

ہے کہ مولانا کی یہ بات برِعظیم پاک و ہند کی سیاسی و سماجی تاریخ کے حوالے سے آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں لینی چاہیے کہ میں کسی خاص پسِ منظر میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔ دنیا کا کوئی کام بھی ہو اس میں بنیادی عنصر انسان کا مزاج ہوتا ہے جو اس کی شخصیت اور سرگرمیوں کو تشکیل دیتا ہے اگر مزاج مجلسی اور تنظیمی ہو تو اسے ضرور زندگی کے کسی منظم قافلے میں شامل ہو جانا چاہیے لیکن اگر مزاج کا بنیادی عنصر تنہائی پسندی یا خلوت گزینی ہو تو ایسا کرنا اپنے آپ کو قتل کرنے کے مترادف ہو جاتا ہے۔ ایسے افراد کے لیے بہتر ہے کہ وہ اپنے لیے زندگی گزارنے

کا کوئی مخصوص خاکہ تیار کریں اس میں رنگ بھریں اور پھر جاتے ہوئے اس کے نقش اپنے بعد کے ہم مزاج افراد کے لیے چھوڑ جائیں! مانا کہ یہ کوئی زیادہ وسیع یا بین الاقوامی سطح کا کوئی آئیڈیل پروگرام نہیں بنتا لیکن اگر توانائی اور صلاحیت کی تنظیم، مزاج کو سمجھ کر نہیں کی جائے گی تو توانائی ضائع ہو جائے گی اور اس سے وہ نتائج بھی حاصل نہیں ہو سکیں گے جو وہ کسی انفرادی پروگرام میں ظاہر کر سکتی تھی۔ بخلاف اس کے اگر کسی عوامی شخصیت کو داخلیت کے خانوں میں بند کر دیا جائے تو اس پر پژمردگی، افسردگی اور بے زاری کی جو کیفیات طاری ہوں گی وہ بھی قابل رحم کہلانے کی حق

دار ہوں گی اس بحث سے اگر ایک لمحے کے لیے جدا
ہو کر دیکھا جائے تو مجھے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ
موجودہ دور کسی بہت بڑی انقلابی تحریک کا طلب گار
ہے ایک ایسی تحریک جو صرف سیاسی سطح پر نہیں بلکہ
تہذیبی سطح پر بھی انقلاب برپا کرے اور اب بنیادی چیز
تہذیبی سطح کا انقلاب ہی ہے کیونکہ جدید تہذیب جن
ہتھیاروں سے لیس ہو کر انیسویں صدی میں برعظیم میں
وارد ہوئی تھی ہمارے ہاں سے اس کا کوئی ٹھوس ردعمل
ظاہر نہیں ہوا ردعمل سے مراد احتجاج نہیں بلکہ تہذیبی سطح
پر رونما ہونے والی وہ تبدیلیاں ہیں جو بدلتے ہوئے
حالات میں ملک و قوم کی از سر نو شیرازہ بندی کرتی ہیں

اور جن کے جلو میں ملّت کا کارواں تیز رفتاری کے ساتھ منازل قطع کرنے کے قابل ہوا کرتا ہے۔ ہم جس سماجی دنیا میں سانس لے رہے ہیں اس کے تقاضوں کو سمجھنا اور پھر اس کے مطابق اپنے رویوں کو ڈھالنا، ان میں شدت پیدا کرنا یا ان میں ترمیم کرنا ہی وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے، اور یہ تقاضا ظاہر ہے کہ کسی بہت بڑے پروگرام کی شکل میں پورا کیا جاسکتا ہے۔

اس بڑے پروگرام کی ترجیحات، تشکیلات اور تفصیلات خاصے غور و خوض کے طلب گار مسائل ہیں۔ لیکن ہم سب اپنی اپنی ذاتی، معاشی اور گروہی مصروفیتوں میں اس طرح الجھے ہیں کہ اس اہم نکتے کی

طرف اب کسی کی نظر ہی نہیں جاتی۔ بات دراصل ترجیحات کی ہوتی ہے جہاں ترجیحات فرنٹ لائن میں آنا، تشہیر اور پراپگنڈے کے پروگرام بنانا، سیاسی ضروریات کے لیے افرادی قوت میں اضافہ کرنا ہوں وہاں پر کسی ایسی تحریک کی عمارت اٹھانا کسی طرح بھی ممکن نہیں رہتا جب تک ہم بے غرض (Self Less) ہو کر اپنی سیاسی، سماجی اور گروہی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر نہیں سوچیں گے یہ خیال ہمارے دلوں میں راسخ ہی نہیں ہو سکے گا اس وقت اگر اس خیال کو پھیلانے یعنی تہذیبی محاذ پر جنگ لڑنے کے لیے کسی شے کی ضرورت ہے تو وہ خود کو ایک بڑی عمارت کی بنیادوں میں خام

مال کے طور پر استعمال کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں نوجوان اور بزرگ (الا ماشاء اللہ) قومی خدمت کے ان کاموں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں جن کے نتیجے کے طور پر انھیں Lime Light میں آنے کا موقع ملے اور ان کی خدمات کا بڑے پیمانے پر اعتراف ہو سکے۔ ہر سلیم الفطرت آدمی اس حقیقت کو تسلیم کرے گا کہ یہ منفی ذہنیت کی غماز علامات ہیں، اس وقت اگر کچھ لوگ قومی خدمت کا کام کر سکتے ہیں تو وہ لوگ ہیں جو مستقبل کی عمارت کی بنیادوں میں خام مال کی جگہ استعمال ہونے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بنیادوں میں

ڈالا گیا میٹیریل کسی کو نظر نہیں آتا لیکن جہاں تعمیر کے
مراحل میں سب سے پہلی قربانی اسی کی ہوتی ہے وہاں
ساری عمارت کا بوجھ بھی اسی بنیاد کے میٹیریل پر ہوتا
ہے۔ اس لیے اب اگر کچھ لوگ بنیاد کا میٹیریل بننے
کے لیے تیار ہو جائیں تو ہماری قوم کی بڑی ہی خوش
قسمتی ہوگی وہ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو نام و نمود،
شہرت و نمائش اور ظاہر پرستی کی تمام بیماریوں سے محفوظ
ہوں اور یہ جانتے ہوں کہ ان کا وجود فقط اساس میں
دب کر رہ جانے والی ان اینٹوں کی مانند ہے، عمارت
تعمیر ہو جانے کے بعد جنھیں کوئی نہیں پوچھتا اور نہ ہی
جن پر عمارت کے حسن و جمال کی تعریف کرنے والوں

کی نگاہیں مرکوز ہوا کرتی ہیں۔ یقین مانو اگر آج بھی
مجھے کہیں ایسا کوئی پروگرام نظر آئے تو میں سب سے
پہلا شخص ہوں گا جو لبیک کہ کر اس کی بنیادوں میں
اپنے جسم کی بھرتی ڈالوں گا۔ اس لیے کہ مجھے معلوم ہے
کہ پاکستان، جس کی آزاد فضاؤں میں آج ہم سانس
لے رہے ہیں صرف چند برسوں میں ظاہر ہونے والے
راہ نماؤں یا تحریکوں کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی بنیاد میں
میرٹھ چھاؤنی کے گمنام سپاہیوں کا خون شامل ہے
جنھوں نے سب سے پہلے اپنے وجود کی قربانی دی اور
آج ہمیں جن کے سوانحی حالات تو کجا نام تک نہیں
معلوم، نجانے اس وقت کتنے جرنیل بخت خان (شخصیت ۳)

گمنامی کے جنگلوں میں نکل گئے جہاں سے آج تک ان کی کوئی خبر مورخ کے قلم یا قوم کے کانوں تک نہیں پہنچی، وہ لوگ اگر آزادی کی تحریک کی بنیادوں کو اپنے خون سے سیراب نہ کرتے تو آج یہ فصلِ گل یوں نہ لہلہاتی بلکہ براعظم پاک و ہند کا نقشہ موجودہ صورت سے بہت مختلف ہوتا، یہ تو ایک تازہ مثال ہے ورنہ قوموں کی تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن میں بارش کا پہلا قطرہ بننے والوں کی جدوجہد ثمر آور ہوئی لیکن جن کے نام پردۂ گمنامی ہی میں پڑے رہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس صورت حال سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں اس میں ہمیں کیا کرنا

چاہیے؟ آیا کسی تحریک کے شروع ہونے یا کسی بڑی تبدیلی کے آنے تک انتظار کرنا چاہیے یا اپنے اپنے دائرہ عمل میں کوئی ٹھوس کام انجام دینا چاہیے؟ اس وقت زیادہ بہتر صورت یہی ہے کہ ہر شخص اپنی ترجیحات کا تعین کرے اور اس کے بعد جب اسے پوری طرح اپنے فیصلے پر شرح صدر ہو جائے تو پھر اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ اس پروگرام کے اچھے مقاصد کے حصول کی سعی میں مصروف ہو جائے لیکن اس راہ کے سخت مقامات سے بچنا جتنا ضروری ہے اتنا شاید ایسا کرنا بھی ضروری نہیں جب تک فرقہ ورانہ اور علاقائی تعصبات کے چنگل سے رہائی حاصل نہیں کی جائے گی

اس وقت تک ہماری سعی کے رائیگاں جانے کے امکانات روشن رہیں گے دور حاضر میں جس طرح ہر فرقہ اور ہر جماعت خود کو مطلق صداقت اور اپنے سوا سب کو باطل محض سمجھتی ہے جب تک اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا جاتا، وسیع ذہن کے ساتھ کام نہیں کیا جاسکتا، کام تو ہوگا مگر گروہ، فرقے اور جماعت کے محدود دائروں میں ہوگا اور جب کام محدود دوائر میں ہوگا تو اس کے نتائج بھی محدود دوائر میں ظاہرہ ہوں گے اس لیے دور جدید میں کام کرنے کے لیے۔ اولاً ترجیحات کا تعین ثانیاً اپنی متعین کردہ ترجیحات پر شرح صدر ثالثاً ''ثم استقاموا'' یعنی ڈٹ جانے کا اصول

رابطہ، صلح کل کی پالیسی کے ساتھ اپنے مثبت پروگرام کی ترویج کی مساعی کے اصولوں کو اختیار کرنا چاہیے۔

ابتدائی سطح پر میں اس سلسلہ میں کسی لمبے فلسفے کا قائل نہیں ہوں کہ موجودہ سیٹ اپ میں انفرادی طور پر یہی آؤٹ لائن کافی سمجھی جانی چاہیے اور دیگر امور کو ان مراحل کے طے کر لینے کے بعد چھونا چاہیے، اس راہ میں سب سے زیادہ اہم چیز طے شدہ امور کو نہ چھیڑنا اور ان پر زیادہ سے زیادہ اتفاق کا مظاہرہ ہے۔

ہم نے اپنے ہوش میں جن تحریکوں کی عمارت اٹھتے ہوئے مشاہدہ کی ہے ان کا یہ پہلو کس قدر افسوس ناک ہے کہ انھوں نے اپنے پروگرام کی بنیاد اتحاد ملت اور غیر

فرقہ وارانہ نعروں پر رکھی لیکن جلد یا بدیر وہ خود کو کسی نہ کسی
خاص فرقے سے منسوب کرنے لگے۔ شاید اس لیے اس
طرح انھیں افرادی قوت حاصل ہو جائے گی یا شاید اس
لیے کہ اس انداز سے وہ جلدی جلدی سماج میں اپنا مقام
یا اپنی شناخت پیدا کرنے میں کامیاب ہوں سکیں گے۔

تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

میرے خیال میں کسی ٹھوس موضوع پر ارتکاز توجہ سے
محرومی ہمارا آج کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اگر یہ ارتکاز
توجہ اپنے تمام تقاضوں کے ساتھ ہمیں حاصل ہو جائے تو
یوں سمجھنا چاہیے کہ ہمارے مسائل کے حل کی کلید ہمارے
ہاتھ آگئی ہے۔ رہے وہ دوست جو انفرادی سطح پر اس منزل

کو پا چکے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ اپنی منتخبہ راہوں پر سفر کے ساتھ ساتھ خود اپنے اوپر تنقید کا راستہ بھی اختیار کریں اور لحظہ بہ لحظہ یہ معلوم کریں کہ ان کا سفر کہاں تک ان کے متعینہ مقاصد کے حصول کی طرف ہے اور کہاں تک اس کا رخ مراجعت کی طرف ہے ایک اور بات جس کی ان راہوں پر بہت زیادہ ضرورت ہے ناکمل رہنے کا احساس ہے جب تک انسان میں یہ احساس زندہ رہے گا اس وقت تک اس میں کچھ کرنے کی لگن آگے بڑھنے کی امنگ اور زندہ رہنے کی تڑپ باقی رہے گی۔

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

طبیب عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی

شخصیات

جن کا مختلف جگہوں پر ذکر آیا ہے

ا۔ اقبال

شاعر، حکیم، فلسفی، ڈاکٹر محمد اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے دور جدید میں اسلامی نظریے کے بہت بڑے مناد اور مبلغ کی حیثیت سے اقبال کا نام چاردانگ عالم میں پھیل چکا ہے۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ **(Reconstruction of Religious thought in Islam)** کے عنوان سے ان کے علمی خطبات اہل علم میں متداول و مقبول ہیں۔ اسلامیانِ برصغیر اقبال کا نام گہری جذباتی عقیدت و محبت سے لیتے ہیں اور ایسا کرنے میں وہ حق بجانب ہیں کہ پاکستان کا تصور اقبال ہی سے منسوب ہے اردو میں غالب کے بعد سب سے بڑے شاعر؛ بانگ درا، ضرب کلیم، بال جبریل، اسرار و رموز، پیام مشرق، زبور عجم، ارمغان حجاز، پس چہ باید کرد وغیرہ اقبال کی شعری تصانیف ہیں جن میں وہ انسان میں خودی کا احساس پیدا کر کے اسے عرفان ذات کی

منزل تک پہنچنے کا پیغام دیتے ہیں اقبال 21 اپریل 1938ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

۲۔ امین احسن اصلاحی

نو جلدوں پر مشتمل تفسیر قرآن "تدبر قرآن" کے مصنف، مذہب اخلاقیات اور فلسفہ پر گہری نظر رکھتے ہیں مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ کے ممتاز ترین طلبا و علما میں شمار ہوتے ہیں حدیث و تفسیر کے ضمن میں اپنا نقطہ نگاہ رکھتے ہیں مولانا حمید الدین فراہی کے شاگرد اور ان کی فکر کے وارث ہیں مذہبی موضوعات پر ان کی متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا مودودی کی جماعت اسلامی کے بانی ارکان میں سے تھے مگر بعد ازاں اختلافات کی بنا پر علیحدہ ہو گئے بقیہ زندگی علمی سرگرمیوں میں بسر کی اور 15 دسمبر 1997ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

۳۔ بخت خان

1857ء کی جنگ آزادی میں جب بہادر شاہ ظفر حوصلہ

ہار رہے تھے جرنیل محمد بخش المعروف بخت خان نے دہلی آ کر انھیں از سرِ نو انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے تیار کیا اور ساتھ ہی فوج کو تیار کرنے کا عزم بھی کیا بہادر شاہ نے انھیں مرزا مغل کی جگہ کمانڈر انچیف بنا کر فرزند کے خطاب سے نوازا، بخت خان نے 9 جولائی 1807ء کو دس ہزار فوج کے ساتھ انگریزوں کو ایک شکست فاش دی۔ بخت خان کی تحریک پر انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد شائع ہوا لیکن دربار میں کچھ لوگ بخت خان کے حاسد تھے اور ہر کام میں اس کے مخالف جس کا نتیجہ بخت خان کی شکست کی صورت میں نکلا۔ غداروں نے بہادر شاہ کو بخت خان سے بدگمان کر دیا جس پر دہلی فتح ہو جانے کے بعد بہادر شاہ نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

بخت خان نے بڑی بے جگری سے انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن بہادر شاہ ظفر اور درباریوں کے اس طرزِ عمل سے مایوس ہو کر جنگلوں میں نکل گئے جہاں سے پھر ان کا کچھ پتہ نہ چلا۔

۴۔ حنیف ندوی: مولانا محمد

10 جون 1908ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے ایک مقامی مسجد میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ندوۃ العلما لکھنؤ سے وابستہ ہوئے پھر لاہور آ گئے۔طویل عرصہ تک مسجد مبارک میں خطابت کے فرائض انجام دیتے رہے، تفسیر، حدیث، کلام، منطق اور فلسفہ ان کے خاص موضوعات تھے 1951ء میں فلسفہ کانگرس کے رکن بنے اور 1981ء میں اس کے اجلاس کی صدارت بھی کی مولانا ندوی ایک تہذیبی روایت کے وارث تھے۔ندوۃ العلما کے آخری قافلے کے مسافر، نہایت دل کش باوقار اور محترم شخصیت کے مالک تھے بقول سراج منیر ''مولانا کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ایک تمدن کتنا مکمل آدمی پیدا کرسکتا ہے۔''

انھوں نے نوجوانی کی عمر میں تفسیر قرآن لکھی جو 1935ء میں شائع ہوئی اس کے بعد ان کی بہت سی کتابیں

شائع ہوئیں جن میں افکار ابن خلدون، افکار غزالی، تعلیمات غزالی، عقلیات ابن تیمیہ مطالعہ قرآن، لسان القرآن، مطالعہ حدیث، مسئلہ اجتہاد، اساسیات اسلام وغیرہ شامل ہیں مولانا نے 12 جولائی 1987ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

۵۔ خورشید رضوی

19 مئی 1942ء کو امروہہ (یوپی) میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم ساہیوال میں حاصل کی بہاولپور سے تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ بیس برس گورنمنٹ کالج سرگودھا میں عربی کے استاد رہے گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرگودھا کے پرنسپل اور ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے صدر شعبہ ترجمہ کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے صدر شعبہ عربی کی حیثیت 7 دسمبر 1995ء کو ریٹائر ہوئے۔

خورشید رضوی ایک کہنہ مشق استاد اور خوش فکر شاعر ہیں ''شاخ تنہا'' ''سرابوں کے صدف'' اور ''رائگاں'' تین شعری

مجموعے اور ڈاکٹر فواد سیزگین کے خطبات کا اردو ترجمہ ''تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام'' ایک تعارفی کتاب ''عربی شاعری'' اور مجموعہ مضامین ''تالیف'' شائع ہو چکے ہیں۔

۶۔ سقراط

(SOCRATES)

مشہور یونانی فلسفی 492ق۔م میں ایک معمولی سنگتراش کے گھر میں پیدا ہوا پہلے خود سنگ تراشی کرتا رہا پھر فوج میں ملازمت اختیار کر لی دو جنگوں میں بھی شرکت کی لیکن پھر ایتھنز واپس آ کر مطالعہ شروع کر دیا سقراط پہلا فلسفی ہے جس نے خیر کا مقصد فلاح نوع انسانی بتایا اور ایسی نیکی کو جس میں اجتماعی بھلائی نہ ہو خود غرضی قرار دیا سقراط کے افکار اس کے عہد میں بہت باغیانہ سمجھے گئے۔ اور اس پر الحاد اور فسق و فجور کے الزامات لگا کر موت کی سزا دی گئی۔

سقراط نے 339ق۔م۔ میں اپنے ہاتھوں سے زہر کا

پیالہ پی لیا لیکن اپنے نظریات وتصورات سے منہ نہ موڑا۔

۷۔ کانٹ

کانٹ کی پیدائش 22 اپریل 1744ء کو کونگس برگ کے ایک دستکاری کے کارخانے میں ہوئی، والدہ سلجھی ہوئی مذہبی شخصیت کی مالک تھیں ان کی تربیت کے زیر اثر کانٹ نے پادری بننا چاہا مگر یونیورسٹی کی تعلیم نے فلسفی بنا دیا...... کانٹ مختلف چھوٹی موٹی ملازمتیں کرنے کے بعد 1770ء میں کونگس یونیورسٹی کے استاد مقرر ہوئے جہاں انھوں نے 1797ء تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد علالت کا شکار رہ کر 12 فروری 1804ء کو انتقال کیا۔

فلسفے کے ایک مستقل مکتبہ فکر ''کانٹیت'' کی بنیاد رکھنے والے اس نام ور فلسفی نے عمر بھر شادی نہ کی۔ وہ ایک دوست نواز، مہربان، خوش خلق اور منظم شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے فلسفہ اخلاق کی بنیاد، علوم طبیعی کی مابعد الطبیعی بنیاد، تنقید عقل

عملی اور تنقید قوت تصدیق وغیرہ بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی اہم ترین کتاب تنقید عقل محض (Critique of Pure Reason) ہے جس پر خاصی تنقید کی گئی اور کانٹ کو جس کے بعض حصوں کی شرح بھی کرنا پڑی تاہم جدید فلسفے کی تاریخ میں اس کتاب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جس میں نظریہ علم کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس کی قبل تجربی یا فوق تجربی کیفیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ کانٹ نے نظریہ علم کو تمام فلسفیانہ علوم کی بنیاد قرار دیا اور اس کی صحت اور قدر و قیمت کا معیار دریافت کرنے کی ضرورت پر زور دیا اس اہم کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا یہ ترجمہ انجمن ترقی اردو ہند سے 1941ء میں شائع ہوا۔

۸۔ مختار مسعود

آواز دوست کے مصنف مختار مسعود، برعظیم پاک و ہند کی جدوجہد آزادی سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ متعدد ہین

الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں مختلف شہروں میں ڈپٹی کمشنر اور پاکستان ایران ترکی کے معاہدہ علاقائی تعاون برائے ترقی (آر سی ڈی) کے جنرل سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں، طویل عرصہ تک وزارت پٹرولیم و قدرتی وسائل کے سیکرٹری رہے اور ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج کے پرنسپل کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ پاکستان، مختار مسعود کے فکروفن کا مرکزی نکتہ ہے اور وہ اپنی ہر توانائی کو اسی مقدس نام پر قربان کرنا چاہتے ہیں۔

مختار مسعود کی کتابوں میں ''لوحِ ایام''، ''سفر نصیب'' اور **Eye Witnessess to History** بھی شامل ہیں لیکن جو مقام ''آواز دوست'' کو حاصل ہے وہ بہت کم کتابوں کو حاصل ہوتا ہے۔

۹۔ ندیم : احمد ندیم قاسمی

دورِ حاضر کے معروف ترین شاعر، افسانہ نگار، کالم نگار

اور مدیر ہیں۔ 20 نومبر 1916ء کو انگہ ضلع خوشاب میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علما و مشائخ کا خاندان ہے۔ احمد ندیم 1942ء میں لاہور آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے ندیم انسانی قدروں کے پاسبان اور مبلغ ہیں افسانہ نگاری اور شاعری دونوں میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے اب تک ان کے پندرہ سولہ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اور رم جھم، دشت وفا، جلال و جمال، شعلہ گل، جمال اور دوام وغیرہ ان کے شعری مجموعے ہیں۔

تہذیب نسواں، پھول، ادب لطیف، امروز، نقوش وغیرہ کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں، ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے آج کل مجلس ترقی ادب لاہور کے ناظم اور رسالہ ''فنون'' کے ایڈیٹر ہیں، ندیم ایک انسان دوست اور پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں ان کے فکر و فن سے آشنائی کیلیے ان کی کتب کے علاوہ رسالہ افکار کراچی کے ندیم نمبر اور جمیل ملک کی

کتاب ''ندیم شخصیت و شاعری'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔

۱۰۔ وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا 18 مئی 1922ء کو پیدا ہوئے۔ 1943ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے معاشیات میں ایم اے کیا اور 1956ء میں اردو ادب میں طنز و مزاح کے موضوع پر پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی وزیر آغا اردو ادب میں انشائیہ کی تحریک کے بانی اور دور حاضر کے ممتاز ترین ادبی نقاد ہیں ان کی اب تک چالیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں شاعری' تنقید اور انشائیہ کے مختلف موضوعات پر ان کی فکر کا اظہار ہوا ہے۔

سرگودھا وزیر آغا کا مولد و مسکن ہے۔ رسالہ اوراق ان کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ وزیر آغا کے فن کی تفہیم کے لیے خود ان کی کتب کے علاوہ ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''وزیر آغا...... ایک مطالعہ'' کی طرف مراجعت مفید ہوگی۔

۱۱۔ ہائیڈگر: مارٹن

جرمن وجودی فلسفی مارٹن ہائیڈگر 26 ستمبر 1889ء کو پیدا ہوئے فرائی برگ یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور 1923ء میں ماربر میں فلسفے کے پروفیسر کے طور پر تقرر ہوا، یہیں قیام کے زمانہ میں 1927ء میں ان کی شاہ کار کتاب **Being & Time** سامنے آئی جس سے انہیں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔

1933ء میں یونیورسٹی کے ریکٹر کے طور پر تقرر ہوا جہاں سے 1934ء میں مستعفی ہو گئے۔ مگر تدریس کا سلسلہ 1957ء میں ریٹائر ہوجانے تک جاری رکھا، ہائیڈگر نے 26 مئی 1976ء کو میکرخ میں انتقال کیا۔

ہائیڈگر کے نزدیک فرد وجود کا محافظ اور اس کی تعبیر کرنے والا ہے، انھوں نے ، مابعد الطبیعیات کیا ہے؟ کانٹ اور مابعد الطبیعیات کا مسئلہ ، افلاطون کا نظریہ صداقت، شے کیا ہے؟ فکر

کیا ہے؟، فلسفہ کیا ہے؟ اور نطشے جیسے اہم موضوعات پر اپنی تحقیقات اور تفکر کے نتائج دنیا کے سامنے پیش کیے اور اس سوال پر غور کیا کہ عدم کے مقابلے میں وجود کا بیان کیونکر کیا جاتا ہے۔

لمحوں کا قرض

زاہد منیر عامر

یہ "آرزو" اگر ایک ندی ہے تو اس کا دریا

"لمحوں کا قرض"

ہے

لمحوں کا قرض میں وہ تمام سوالات آ گئے ہیں جن سے آج کے نوجوان کو سامنا ہے۔

وہ سوالات معاشرہ جن سے نظریں چراتا ہے اور تعلیم گاہیں جن سے بے خبر ہیں۔

اپنے عہد کی آواز بن جانے والی کتاب

لمحے کی روشنی

زاہد منیر عامر

"لمحے کی روشنی نے تو مجھے حقیقت میں لمحۂ موجود میں لا کھڑا کیا اور یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ میں کیا ہوں۔ اب سے پہلے سوئے ہوئے لفظوں میں ماضی کی تھکن اور جاگتے لفظوں میں مستقبل کے خوابوں کا بیان ہی میرا حاصل رہا۔ ماضی اور مستقبل کے بیچ لمحہ موجود کہاں کھو گیا میں نے کبھی سوچا نہ پرواہ کی لیکن آج اس کتاب کا پہلا مضمون لمحۂ موجود پڑھتے ہوئے جس روانی سے آنکھوں سے آنسو بہے مجھے یقین ہے کہ ندامت کے یہ آنسو مجھے صحیح راہ پر لے آئیں گے۔"

(ایک خط سے اقتباس)

تناظر مطبوعات ○ لاہور

ترا عکس آئنوں میں

زاہد منیر عامر

اس شعری مجموعے میں کہیں محبت شفق بن کر سکتی روشنی کی ساعد سیمیں کو تھامتی دکھائی دیتی ہے اور کہیں اداسی گھنے اشجار سے پتوں کی صورت پھوٹتی نظر آتی ہے کبھی فریب دوش و فردا ساعت امروز میں گم ہیں اور کبھی ریگِ ساعتِ امروز میں ستارے جھلملاتے ہیں۔

بہ قول منیر نیازی زاہد منیر عامر جیسے شعرا اپنی شاعری میں نئے پن اور تازگی کے سبب شعری جمال کی دریافت میں مصروف رہتے ہیں اور عہد کا ادبی اور شعری منظر سرسبز اور شاداب رہتا ہے۔

خزینۂ علم و ادب

الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

محبت امتحاں ہے

زاہد منیر عامر

دوستی کیا ہے؟ دوستی محبت میں کب بدلتی ہے؟ محبت عشق کا
مقام کیسے اختیار کر لیتی ہے؟ عشق کا حاصل کیا ہے؟
یہ مختصر سی کتاب ان تمام سوالات سے بحث کرتی ہے۔
"آرزو" کی طرح ایک نادر تحفہ

(زیر طبع)

تناظر مطبوعات ○ لاہور

مصنف کی بعض دوسری کتابیں

۱۔ لمحوں کا قرض	۱۹۸۹ء
۲۔ مکاتیب ظفر علی خان	۱۹۸۶ء
۳۔ اپنی دنیا آپ پیدا کر	۱۹۸۹ء
۴۔ اقبال شناسی اور نوید صبح	۱۹۹۰ء
۵۔ نقوشِ جاوداں	۱۹۸۸ء
۶۔ مولانا تاج محمود۔ حالات و مکتوبات	۱۹۸۵ء
۷۔ مولانا ظفر علی خان۔ کتابیات	۱۹۹۳ء
۸۔ علامہ اقبالؒ کی تاریخ ولادت۔ ایک مطالعہ (بہ اشتراک)	۱۹۹۳ء
۹۔ جہات (تحقیقی مقالات)	۲۰۰۰ء
۱۰۔ میر سوز۔ سوانح اور شخصیت	۲۰۰۰ء
۱۱۔ پہلی سحر کے رنگ (شعری مجموعہ)	۱۹۸۹ء
۱۲۔ ترا عکس آئنوں میں (شعری مجموعہ)	۲۰۰۰ء
۱۳۔ لمحے کی روشنی	۲۰۰۱ء
۱۴۔ ارمغانِ شیرانی (بہ اشتراک)	۲۰۰۴ء

